قسط ۱

جناب مولانا حکیم محمود احمد ظفر صاحب سیالکوٹی

اسلام کا تصوّرِ نبوّت

حکیم صاحب موصوف نے اسلام کے نکھرے ہوئے تصوّرِ نبوّت کو اکابر سلف کی تحقیقات کی روشنی میں پیش فرمایا ہے۔ ہم موصوف کے ممنون ہیں۔ اور اس گرانمایہ مضمون کی تکمیل کی توقع رکھتے ہیں۔ (ادارہ)

جس طرح اسلام میں خدا، آخرت، اعمال اور عذاب و ثواب کا تصوّر دوسرے مذاہب و ادیان سے جدا اور علیحدہ ہے۔ اسی طرح نبی اور اُس کی نبوت کا تصوّر بھی اسلام میں دنیا کے سب ادیان سے جداگانہ ہے۔ کئی مذاہب و ادیان، دوسرے سے نبوّت ہی کے قائل نہیں اور کئی نظریۂ نبوت کے قائل تو ہیں۔ لیکن نبی میں حق تعالیٰ کے حلول و اتحاد اور قرابت و ولادت کے نظریہ کے قائل ہیں۔ جو کہ خالق و مخلوق کی سرحدوں کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ کئی مذاہب نبی کو خدا کا وجود تصوّر کرتے ہیں۔ جو کہ انسانی ہیکل میں عالمِ لاہوت سے عالمِ ناسوت میں کچھ خاص اغراض کے تحت جلوہ گر ہوتا ہے۔ کئی مذاہب نبوّت کے متعلق کچھ ایسے نظریات رکھتے ہیں جن سے حق تعالیٰ اور نبی کے درمیان کسی نہ کسی طریقہ سے شراکت اور مماثلت کی کچھ نہ کچھ پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ لیکن نبوّت کا جو تصوّر اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ ان سب ادیان اور مذاہب سے علیحدہ اور بالاتر ہے۔ وہ نہ تو براہمہ کی طرح نبی کو اللہ رب العزّت کا اوتار اور بروز تصوّر کرتا ہے۔ اور نہ ہی عیسائیت کی طرح اس کو ایک عام انسان کی طرح گناہوں سے ملوّث گردانتا ہے۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنے مقام پر اور نبی کو اپنے مقام پر رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ـــــ ع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

وہ کبھی بھی نبی کو ایسے مقام پر نہیں لے جاتا، جہاں عبدیت اور معبودیت کی سرحدیں ملتی ہوں۔ اور خالق و مخلوق کے مابین شراکت کے شبہات پیدا ہوتے ہوں۔ اور جہاں عیسائیت کی طرح نبی اور حق تعالیٰ کے درمیان کسی قسم کا کوئی التباس واقع ہوتا ہو۔ جس سے پھر اُس کی ایسی تاویلیں کرنی پڑیں۔

کہ وہ پھر عقلی اور فکری مسئلہ نہ رہے۔ بلکہ ایمان کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہو جائے۔ عیسائیت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ کہ پہلے تو انہوں نے جناب عیسیٰ علیہ السلام میں الوہیت کی کچھ شؤن و صفات دکھائیں۔ اور پھر جب دنیا کے مفکروں نے عقل و فکر اور علم و خرد کی کسوٹی پر اس کو پرکھنا چاہا تو ایمان کا ایک بھید کہہ کر راہ فرار تلاش کی۔ چنانچہ عقیدۂ اتھانیسس میں جو کہ عیسائی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ صاف اور صریح الفاظ میں آتا ہے:

"خدا میں تین شخص ہیں۔ باپ، بیٹا، روح القدس۔ خدا اُس پاک تثلیث کا پہلا شخص جو بیٹے اور روح القدس کا شروع ہے۔ یہ تینوں شخص آپس میں بالکل برابر ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ اس لئے تینوں یکساں الٰہی عزت کے لائق ہیں۔ یسوع مسیح سچا خدا اور سچا آدمی بھی ہے۔ اور مقدسہ مریم سچ مچ خدا کی ماں بنی۔ باپ خاص کر قادرِ مطلق اس لئے نہیں کہلاتا کہ وہ زیادہ قدرت والا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ پاک نوشتوں میں قدرت باپ کی، دانائی بیٹے کی اور پاکیزگی روح القدس کی کہلاتی ہے۔ (مسیحی تعلیم باب پاک تثلیث صفحہ ۱۹-۲۷ لاہور)

اس خلافِ عقل اور خلافِ فطرت بات کو جب مفکرین نے فکر و نظر کی نگاہ سے جانچنا شروع کیا تو ان کے اعتراضات سے بچنے کے لئے اور مسیحی بھیڑوں کو اپنے سے جدا نہ ہونے دینے کے لئے یہ کہہ دیا:

"ہم اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ ایمان کا یہ ایک بھید ہے۔[1]" (حوالہ مذکور صفحہ ۲۰)

اس کے برعکس اسلام نے جو تصور نبوّت پیش کیا ہے۔ اُس میں خالق و مخلوق کی سرحدات الگ الگ ہیں۔ اور ان دونوں کی آپس میں کوئی شراکت نہیں۔

حکیم الامت دہلویؒ نے اس نظریہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔۔۔

الوجدان الصریح یحکم بان العبد	وجدان صریح اس بات کا اقرار کرتا ہے
عبد وان ترقیٰ والرب رب وان	کہ بندہ بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی
تنزل وان العبد قط لا یتصف	ارتقائی منازل کو طے کیوں نہ کر جائے۔

---

[1] عیسائی عقائد کی واقفیت کے لئے میری کتاب "مسیحیت پر ایک تحقیقی نظر" (اردو) اور "Islam's Contribution to civilization" (انگریزی) کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جو "ادارہ معارفِ اسلامیہ" سیالکوٹ سے مل سکتی ہیں۔

بالوجوب اوبالصفات اللازمة للوجوب[1] — اور ربّ ربّ ہی ہے۔ خواہ وہ اپنے بندوں کے کتنا ہی قریب کیوں نہ آجائے اور بندہ کبھی درجۂ وجوب یا اُن صفات کو جوکہ وجوب کے لئے لازم ہیں، متصف نہیں ہوسکتا۔

اس مسئلہ کو ویسے تو امام ابوالحسن الشعریؒ۔ قاضی ابوبکر الباقلانیؒ۔ ابن حزم اندلسیؒ۔ ابواسحٰق الفرائینی۔ عبدالکریم الشہرستانی۔ امام غزالیؒ۔ امام فخرالدین رازیؒ۔ علامہ سیف الدین آمدی ابن خلدونؒ اور ابن تیمیہؒ وغیرہ متکلمین اور محققینِ اسلام نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لیکن متقدمین میں امام غزالیؒ نے "المنقذ من الضلال" اور "معارج القدس" میں اور متاخرین میں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں نہایت تحقیق اور علمی پیرایہ میں اس مسئلہ کو بیان فرمایا ہے۔ بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے تو ہزار برس کی تحقیقات کا عطر اور نچوڑ "حجۃ اللہ البالغۃ" کے چند اوراق کے سینہ میں بند کرکے رکھ دیا ہے۔

نبی کی تعریف

نبوّت کے دوسرے پہلوؤں پر گفتگو کرنے سے قبل لفظ "نبی" کی تعریف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ——— بعض کا قول ہے کہ نبی کا لفظ "نَبَاوَۃ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے " اونچی شے" چونکہ نبی اپنے مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے بہت اونچے مقام کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو نبی کہتے ہیں[2] لیکن اکثر کے نزدیک نبی کا لفظ مشتق ہے۔ "نَبَأٌ" سے جس کا معنی ہے خبر۔ لیکن لغتِ عرب میں ہر خبر "نَبَأٌ" نہیں کہلاتی بلکہ نَبَأٌ اُس خبر کو کہتے ہیں۔ جس میں تین چیزیں ہوں۔ ۱۔ خبر فائدے کی ہو۔ ۲۔ فائدہ بھی عظیم الشان ہو۔ ۳۔ اُس خبر سے سننے والے کو اطمینانِ قلب اور یقین کامل حاصل ہو۔

اس معنی کی رو سے نبی کی تعریف یہ ہوئی کہ وہ انسان جس نے حق تعالیٰ کے بندوں کو حق تعالیٰ کی جانب سے اُن کے نفع اور فائدے کی ایسی عظیم الشان خبریں سنائی ہوں جن تک اُن کی نارسا عقلوں کی رسائی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں وہی ہوں گی جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہوں۔ اور پھر ان خبروں پر اطمینان یا علم اُسوقت حاصل ہوگا جب خبر دینے والا اُس پر اللہ ربّ العزّت کی طرف سے کوئی دلیل بھی پیش کرے یا صرف اس کی زندگی ہی اتنی پاکیزہ اور اتنی اعلیٰ اور مقدّس ہو کہ اس کے متعلق کذب کا وہم وگمان بھی نہ ہوسکے اور اس کی بات سنتے ہی لوگوں کو یقین آجائے۔ معلوم ہوا کہ صرف "نبی" کا لفظ ہی لغتِ عرب کی رو سے ان حقائق پر روشنی ڈالتا ہے[3]

---

[1] تفہیمات الٰہیہ صـ ۱۸۴ [2] کتاب المسامرۃ فی شرح المسایرۃ جلد ۲ صـ ۴۲، المسایرۃ صـ ۱۱۸، مجمع البحار جلد ۳ صـ ۳۲۹ منتہی الارب جلد ۴ صـ ۱۷۹، فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۶ صـ ۲۷۸ [3] مفردات امام راغب اصفہانی صـ ۴۹۹۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس تعریف کو ذرا اور لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں :

"اسلام کی زبان میں نبی وہ مقدس شخصیت ہے جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی منشا اور مرضی بتاتا ہو۔ اور پھر وہ اُن احکام کو دوسروں تک پہنچاتا ہو۔ دین و دنیا کے مصالح اور منافع کے لئے ایک دستور اساسی، ایک قانونِ حیات اور ایک نظام العمل پیش کرتا ہو۔ ایک مصلح ہو اور اپنے اندر اصلاحی داعیات بھی رکھتا ہو" (النبوات ص۱۷۲ تا ص۱۷۴)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نبی کی تعریف میں اور لطافت اور اختصار پیدا فرما دیا ہے۔ فرماتے ہیں :

"نبوت توجہ الی الحق اور توجہ الی الخلق کی صفت کے کمال کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں نبی وہ ذات ہے جو ہر وقت حق کی طرف بھی متوجہ رہے اور خلقِ خدا پر بھی نظر رکھے۔ حق کی طرف توجہ کرنے سے خلق خدا کی طرف اس کی توجہ کم نہ ہو اور خلقِ خدا کا خیال حق کی لگن میں خلل انداز نہ ہو" (مکتوبات)

نبوت کی اس بحث کو حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک اور انداز میں بیان فرمایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے :

"علم وعمل اور فضل وکمال کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجات ہیں۔ اُن میں سب سے اعلیٰ اور بلند وبالا درجہ "مفہمین" کا ہے۔ یہ لوگ ایک خاص اصطلاح اور مخصوص طریق اصلاح کے حامل ہوتے ہیں۔ اُن کی قوت ملکیہ بہت بلند ہوتی ہے۔ داعیۂ حقانی اور صحیح اور سچے جذبات کے ساتھ اُن کے لئے دنیا میں ایک خاص نظام کو قائم کرنا آسان اور سہل ہوتا ہے۔ اور یہ لوگ وہ خاص نظام قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوا کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ان پر علوم عالیہ اور احوال الٰہیہ کا ترشح ہوتا ہے۔ "مفہم" کی سیرت یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ معتدل مزاج ہوتا ہے۔ اُس کی خلقت، پیدائش اور اخلاق وعادات بالکل صحیح اور درست ہوتی ہیں۔ اس کے اندر جزئی رایوں اور جزئی واقعات کی بناء پر زیادہ اضطراب نہیں ہوا کرتا۔ وہ نہ تو اس قدر تیز ہوتا ہے۔ کہ صرف کلیات وتخلیات ہی میں الجھ کر رہ جائے۔ اور نہ اس قدر بلید اور غبی کہ صرف جزئیات ہی میں الجھا رہے اور جزئیات سے کلیات تک اور صورت سے روح تک پہنچنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ وہ سب سے زیادہ سنت راشدہ اور ہدایت کے راستہ کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے۔

عبادات میں بھی وہ بلند مرتبے کا حامل ہوتا ہے۔ معاملات میں بھی لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف برتنے میں اُس کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور انفرادی بھلائی کا لحاظ نہیں کرتا۔ بلکہ تدبیر کلّی اور منفعت عامہ کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ کسی کو ایذا پہنچانا بالکل گوارا نہیں کرتا۔ اور اگر کسی کو تکلیف اور ایذا پہنچ بھی جاتی ہے تو کسی عارضی سبب کی وجہ سے یعنی یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور اس شخصی نقصان کو گوارا کر لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے امور میں عالم غیب کی طرف مائل اور راغب رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی بات چیت، کام کاج، پھرے اور پیشانی کے تیوروں سے بھی میلان و رغبت کے اثرات مترشح ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کی زندگی کی ہر شان اور ادا سے میلان و رغبت ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کو ایسا پاتا ہے کہ عالم غیب سے اُسکی تائید ہو رہی ہے۔ اُسے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ ریاضت سے قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس قرب الٰہی سے اُس پر سکون و طمانیت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں۔ جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

"مفہمین" اپنی مختلف استعداد اور قابلیت کی وجہ سے مختلف مدارج کے حامل ہوا کرتے ہیں۔

اوّل ــــ وہ مفہم جس کو اکثر و بیشتر ریاضات و عبادات کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس کے علوم کی تلقین ہوا کرتی ہے۔ ایسا مفہم "کامل" کہلاتا ہے۔

دوم ــــ وہ مفہم جسے اکثر و بیشتر اخلاق فاضلہ، تدبیر منزل اور اسی قسم کے دوسرے علوم کا القاء ہوتا رہتا ہے۔ ایسا مفہم "حکیم" کہلاتا ہے۔

سوم ــــ وہ مفہم جسے عمومی تدبیر و سیاست اور نظام کلّی کی اصلاح کے علوم کا القاء کیا جاتا ہے۔ اور اُسے لوگوں میں عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور ظلم و جور کے استیصال کی توفیق عطا کی جاتی ہے۔ ایسا مفہم "خلیفہ" کہلاتا ہے۔

چہارم ــــ وہ مفہم جس پر ملاء اعلیٰ کا نزول ہوتا ہے اور اُسے وہاں کی حضوری حاصل ہوتی ہے۔ وہاں کی تعلیم سے وہ سرفراز ہوتا ہے۔ اور اس سے مختلف قسم کے تصرفات اور خرق عادت امور صادر ہوتے ہیں۔ وہ "مؤید بروح القدس" کہلاتا ہے۔

پنجم ــــ وہ مفہم جس کی زبان و قلب میں انوار و تجلیات ہوں۔ لوگ اُس کی رفاقت و صحبت اور پند و موعظت سے مستفید ہوں اور وہ انوار و تجلیات صرف اس کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں

بلکہ وہ اس کے رفقائے خاص تک میں بھی منتقل ہوں جس سے وہ کمال و ارتقاء کے مدارج عالیہ تک پہنچ جائیں۔ ایسے مفہم کو "ہادی" اور "مزکی" کہتے ہیں۔

ششم ــــ وہ مفہم جس کے علم کا بڑا حصہ امت اور ملت کے اصول و قواعد اور اسکی مصلحتوں کی واقفیت پر مبنی ہو اور جس میں ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو۔ ایسا مفہم "امام" کہلاتا ہے۔

ہفتم ــــ وہ مفہم جس کے قلب میں یہ القاء کیا جائے کہ وہ لوگوں کو اُن بڑے بڑے مصائب و آلام سے خبردار کرے جو دنیا میں اُن لوگوں کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی قوم کے متعلق اُس کو بتایا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی بداعمالی اور مسلسل نافرمانی کی وجہ سے ملعون و مردود ہو چکی ہے، وہ اس قوم کو اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یا بعض اوقات اپنے تجرد نفس اور صفائی باطن کی وجہ سے وہ قبر و حشر میں پیش آنے والے واقعات کو معلوم کر لیتا ہے۔ اور وہ اس سے لوگوں کو آگاہ اور باخبر کر دیتا ہے۔ ایسے مفہم کو "منذر" کہتے ہیں۔

ہشتم ــــ وہ مفہم کہ جب حکمتِ الٰہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے۔ کہ کسی ایسے مفہم کو مبعوث فرمائے جو لوگوں کو ظلمات اور تاریکیوں سے نکال کر نور اور روشنی میں لائے اور گمراہی اور ضلالت کے راستہ سے موڑ کر ہدایت و اصلاح کا راستہ دکھائے تو حق تعالیٰ اپنے بندوں پر لازم اور فرض کر دیتا ہے۔ کہ وہ اپنے ذہن و قلب کی ساری قوتیں اُس کے حوالہ کر دیں اور ملاء اعلیٰ میں بھی تاکید ہوتی ہے۔ کہ جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے اس سے ناخوشی کا اظہار کیا جائے۔ اور وہ لوگوں کو ان امور سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری لوگوں پر لازم قرار دے دیتا ہے۔ ایسے مفہم کو "نبی" کہتے ہیں۔" (حجۃ اللہ البالغہ باب حقیقۃ النبوۃ وخواصہا ص۶۶)

نبی کی ان سب تعریفوں کا عام اور سادہ زبان میں خلاصہ یہ ہے۔ کہ انسان روح اور مادہ کی ترکیب کا نام ہے۔ اس کی روح اور مادہ کی ترکیب نے اس کی حیات کو بھی دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ یعنی ایک اس کی مادی حیات اور دوسری اس کی روحانی حیات۔ ان دونوں زندگیوں میں سے ہر زندگی کے طور و طریق الگ الگ ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ جس نے انسان کو زیورِ حیات سے مرصع کیا اُس نے اس بات کی ذمہ داری بھی لی ہوئی ہے۔ کہ اس کی زندگی کی تمام ضروریات کا کفیل میں ہوں۔ چنانچہ فرمایا :

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ — زمین پر چلنے والا کوئی نہیں مگر اُس کی روزی

رِزْقُهَا۔ (ھود ع ۱) اللہ کے ذمہ ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (طلاق ع ۱۷)

اور جو اللہ سے ڈرے وہ اس کے لئے راستہ نکال دیتا ہے۔ اور اُس کو رزق ایسی جگہ سے دیتا ہے۔ جہاں سے گمان بھی نہ ہو۔

انسان کی اس مادی حیات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے خلّاق عالم نے طرح طرح کے انسان پیدا فرمائے جنہوں نے دوسرے انسانوں کو مادی زندگی بسر کرنے کے طریق سکھائے۔ زندگی بسر کرنے میں جو جو ضروریات انہیں لاحق ہوئیں اُن کو پورا کیا۔ چنانچہ ان حضرات نے انسانوں کو کاشتکاری کے اصول، خورد و نوش کے طریق، ازالۂ مرض کی تدابیر، بود و باش کے سامان، سواری وغیرہ کی ضروریات غرضیکہ اُن کی مادی حیات کی تکمیل میں قدم قدم پر اُنہیں جتنی بھی ضروریات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان لوگوں نے اُن کو پورا کیا۔

انسان بیمار ہوا، انہوں نے دوا دی۔ یہ بھوکا ہوا، انہوں نے کھانا کھلایا۔ یہ ننگا ہوا انہوں نے اس کی عریانی کے ازالہ کیلئے کپڑا بنا کر پیش کیا۔ اس کو دفع مضرت کے لئے لڑنے کی ضرورت پیش آئی، انہوں نے اس کو تلوار، نیزہ اور رائفل وغیرہ آلات حرب مہیا کئے۔ تاکہ یہ انسان بطریق احسن اپنی مادی زندگی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

اس مادی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی زندگی کی ضروریات کا جن کو ہم اصول تمدّن، طریقۂ معاشرت، اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دور شروع ہوتا ہے۔ اور یہ حیات ایسی ہے جو صرف حضرت انسان کے لئے مختص ہے۔ مادی زندگی میں حیوان بھی انسان کے ساتھ مشترک ہے۔ مگر اس روحانی زندگی میں انسان کو دیگر حیوانات سے شان امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ اگر اس کی یہ روحانی حیات نہ ہو تو اس کی مادی زندگی کی جنّت جہنم بن جائے اور یہ اشرف المخلوقات جماعت درندوں کا غول اور چرندوں کا گلہ ہو کر رہ جائے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)